مسئلہ خلافت کی عملیت میں عرب وعجم زاویہ فکر کے اثرات کا علمی جائزہ

An Academic Review of the Practical Implications of Caliphate upon the Oriental and Occidental Thought Pattern

ضیاء الحق*

ڈاکٹر رشاد احمد**

Abstract:

Ever since man has stepped on earth and tried to implement a collective social life pattern, then onwards the idea of the establishment of state has come into existence. History has witnessed diverse governance patterns as per indigenous values and ideologies. At the time of advent of Islam, there was monarchy and kingship that prevailed beyond the deserts of Arabia that sustained on royal descendants, whereas, in Arabia rulers would be selected upon their competence and acumen for ruler ship. When Islam came, religious angle was included too however, the various modes of interpretation became a bone of contention later on. In this research article, a review of oriental and occidental thought patterns have been reviewed. Similarly it has been tried to assess how diverse and divergent these two points of view remained.

انسان نے جب روئے زمین پر قدم رکھا اور اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کی ضرورت کا احساس کیا تو ریاست کے قیام کا تصور پیدا ہوا اور ہر دور میں چھوٹے بڑے معاشروں میں لوگوں کے مخصوص اقدار و تصورات کی بنیاد پر حکمرانی کی عملی صورتیں سامنے آئیں، اسلام کی آمد کے وقت عرب سے باہر کی دنیا میں سلطنت و بادشاہت کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جو نسل کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، جب کہ عرب دنیا میں قیادت وحکمرانی کا معیار فرد کی قوت اور حکمرانی کی صلاحیت وسیاسی بصیرت پر مبنی تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد ریاست کے ادارے کو مذہبی زاویہ فکر ملا، تاہم مذہب کی تعبیر وتشریح کے فرق کی وجہ سے امرِ خلافت ایک نزاعی امر بن گیا۔اس تحقیقی مقالہ میں ریاست کے حوالے سے عرب وعجم زاویہ فکر کا جائزہ لیا گیا ہے

* لیکچرر/پی ایچ ڈی سکالر، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ، پشاور

** پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پشاور

اور اس کے ساتھ اس امر کے تعین کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی سلطنت یا خلافت کے قیام ونفاذ میں عرب وعجم کے متفاوت زاویہ فکر کا کردار کس حد تک رہا؟

تعارف موضوع:

دنیا کی ہر شے میں تنوع ہے، کوئی چیز اپنے ہی جنس کی دوسری چیز کی طرح نہیں، گویا یہ کائنات اختلافات کی رنگارنگی اور تنوعات کے عجائبات کا ایک نگارخانہ ہے، اس کا حسن اختلافات کی گوناگونی کا نتیجہ ہے، تنوع (Diversity) ہی اس کائنات کا سب سے خوبصورت پہلو ہے، شاید یہی تنوع اس کائنات کے حسن، بقاء اور ارتقاء کا ضامن ہے۔

اختلاف وتنوع صرف کائنات کا ہی عنوان نہیں بلکہ نفسِ انسانی بھی اس کی رزم گاہ ہے، ایک انسان کا دوسرے سے چہرہ، رنگ وروپ اور آواز وگفتار کا ہی اختلاف نہیں بلکہ ان کے افکار میں بھی نہایت درجہ کا فرق ہے، لہٰذا ایک انسان کی سوچ یقینی طور پر دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہے۔ قرآن نے اس اختلاف کو خدا کی نشانی قرار دیا ہے:

"إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الأَلْبَابِ"[1]. (ترجمہ): بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور لیل ونہار کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

لہٰذا اختلاف ایک فطری حقیقت ہے جب تک وہ فطرت سے ہم آہنگ ہے تو حسنِ حیات ہے۔ پھر انسان عقل وشعور اور سوچ بچار کی صلاحیت رکھتا ہے، فکر اللہ کی عظیم نعمت ہے، جدید تحقیقات کے مطابق دو انسانوں کی آوازیں حتیٰ کہ ایک آدمی کے ہاتھ کی لکیریں بھی دوسرے انسان کے ہاتھ کی لکیروں سے جدا ہوتی ہیں، سب کے عقل وشعور کی قوتیں بھی مختلف ہیں، غور وفکر کے انداز بھی الگ ہیں اور غور وفکر سے ہی اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اختلاف رائے کو اسلام مثبت نظر سے دیکھتا ہے، ہر انسان کو کسی بھی مسئلہ میں اپنی رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق دیا گیا ہے، ارشاد باری ہے:

"قَدْ جاءَكُمْ بَصائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْها وَ ما أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفيظ"[2]

(ترجمہ): دیکھو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں"۔

اسلام کا تصورِ خلافت:

خلافت، امامت اور امارت کے الفاظ فقہ و کلام کی کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں، تاہم اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو فرق stateاور governmentکے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور امامت وامارت کے درمیان ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس میں قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے۔ منشائے تخلیق کے اعتبار سے تو اس منصب کے اہل سارے ہی انسان ہیں۔ اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ بھی ہر ایک کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کو اس منصب پر مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کو اختیار کرے چاہے تو اختیار کرے۔

خلافت کے حوالے سے نہ اسلام کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ خلافت کو قرآن نے کسی مخصوص قبیلہ یا نسل میں محدود نہیں رکھا بلکہ روئے زمین پر رہنے والا ہر شخص اگر سیاسی بصیرت رکھتا ہے اور خود کو اس بارِ گران کو اٹھانے کے قابل سمجھتا ہے تو وہ خلیفہ بن سکتا ہے جیسا کہ امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> " خلافت کی اساس قوم یا وطن یا نسل اور نسب کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور جہانی ریاست ہے، یہ نظام کامل مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ خلافت کا منصب کسی خاص شخص یا گروہ یا طبقے کو حاصل نہیں ہے بلکہ اصلاً ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہوتی ہے تو وہ محض اہلیت و صلاحیت کی بنا پر اور یہ بھی لوگوں کے مشورے اور مرضی سے "۔ [۳]

چنانچہ انہی اصول پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام نے نظام خلافت کی بنیاد رکھی اور خلیفہ کے انتخاب میں جمہور کے مشورہ کی شرط لازم ٹھرائی اور خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں بھی شوری کو ضروری قرار دیا۔ لیکن بعد کے ادوار میں نظامِ خلافت میں بعض عوامل کی وجہ سے اختلافات کا آغاز ہوا۔

مسئلہ خلافت میں اختلاف کا جائزہ:

کسی بھی مسئلہ کی جڑ تک رسائی اس وقت تک حاصل نہیں کی جاسکتی جب تک اس مسئلہ کا تمام جہات سے مطالعہ کرکے اس کے سیاسی، معاشرتی اور تاریخی پسِ منظر کا تعین نہ کیا جائے۔ دراصل تمام قسم کے نظریاتی اختلافات کی اصل وجہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں کوئی سیاسی ومعاشی یا کسی اور قسم کے مفادات کا تنازعہ چل رہا ہو، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں فکری یا نظریاتی اختلاف کے پیچھے عام طور پر کوئی سیاسی یا اقتصادی کشمکش ہوا کرتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظریاتی اختلاف کے حاملین کو بھی اس حقیقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ معاشرتی اختلاف عموما کسی بھی معاشرہ میں سیاسی یا معاشی عدم توازن کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ جس میں کوئی فرد یا طبقہ احساس محرومی کا شکار ہو۔ امت مسلمہ میں مختلف فرقوں کی تشکیل میں مسئلہ امامت وخلافت نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، چنانچہ شہرستانی (م۵۴۹ھ) کہتے ہیں:

"وأعظم خلاف بين الأمة خلاف الإمامة، إذ ما سل سيف فى الاسلام علي قاعدة دينية مثل ما سل على الإمامة فى كل زمان"[٤].

''امت مسلمہ میں سب سے بڑا اختلاف امامت کے مسئلے پر ہے، کیونکہ اسلام میں ہر دور میں امامت کے مسئلہ پر اس قدر تلوار زنی ہوئی کہ کسی اور دینی مسئلہ میں اس کی مثال نہیں ملتی''۔

یوں امتِ مسلمہ میں اصل اختلاف کا آغاز صدر اول میں پیدا ہونے والے سیاسی اختلافات سے ہوا اور اسی سیاسی اختلاف کے پس پردہ عوامل میں جہاں قرآن وحدیث کی تشریح میں اختلاف کا عنصر نمایاں تھا تو وہاں بعض قدیم قبائلی تعصّبات بھی تھے جن سے اسلامی معاشرہ ابھی تک مکمل طور پر پاک نہیں ہوا تھا تاہم خلافت کے حوالے سے عرب وعجم کی مختلف سوچ اور نفسیات کے تنوع نے بھی تقسیمِ امت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، جس پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، لہٰذا ذیل میں ہم مسئلہ خلافت کے حوالے سے عرب وعجم زاویہ فکر کے تنوع کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مسئلہ خلافت اور عرب وعجم کا مختلف زاویہ نگاہ:

افراد میں اختلاف کی ایک بنیادی وجہ (جسے آج کل کی دنیا میں خاصی اہمیت دی جاتی ہے) نفسیات و طبائع کا اختلاف ہے، کیونکہ کسی مخصوص علاقے کا ماحول، وہاں کی روایات اور لوگوں کا زاویہ فکر دوسرے علاقے سے عموماً جدا ہوا کرتے ہیں اور بسا اوقات اچھائی یا برائی کے پیمانے بھی بڑی حد تک مختلف ہوا کرتے ہیں، چنانچہ ایک کام ایک علاقے میں اچھا سمجھا جاتا ہے اور وہی کام کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کے ہاں نامناسب تصور کیا جاتا ہے:

"فما دام الناس يختلفون في ألوانهم وألسنتهم، وطبائعهم وطُرق معايشهم، وفي البيئة التي يَحْيَون فيها، وفي الثقافة التي يَنْهَلون منها، فإنهم لا شك يختلفون في آرائهم وتفكيرهم".[۵]

(ترجمہ): جب لوگ رنگ وزبان، مزاج، رہن سہن کے طریقوں، وہ ماحول جس میں وہ رہتے ہیں اور وہ تہذیب جس سے وہ فکری سیرابی حاصل کرتے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو یقیناً اس کے نتیجے میں وہ اپنی آراء وخیالات کے اعتبار سے بھی مختلف ہوں گے۔

زمان ومکان اور بعض سماجی اقدار اور سوچ وبچار کے مختلف پیمانے ہی دراصل اختلاف کی بنیادی جڑ ہوا کرتی ہیں، غور وفکر کے پیمانوں سے مراد کسی چیز پر غلط یا صحیح ہونے کا حکم لگانے کے وہ مخصوص ترازو ہیں جو مختلف اقوام کے ہاں مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ اچھائی یا برائی کے پیمانوں کا اختلاف باہمی اختلاف کا سبب بنتا ہے، مذکورہ بیان کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ چیزوں کے تجزیہ کے لیے وحی کو پیمانہ حق خیال کرتے ہیں وہ عموماً اس معیار کی حد تک عقلی چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اسی طرح جو لوگ خوابوں اور افسانوں کی دنیا میں رہتے ہیں وہ عقل وبرہان پر مبنی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے اور جو ایمان بالغیب کے قائل ہیں وہ مادہ کی حقیقت کو اشیاء کے وجود میں بطورِ وجودِ خودی تسلیم نہیں کرتے۔

ہر علاقے کی زمینی خاصیت، آب وہوا، لوگوں کی عادات وتقالید اور رہن سہن چونکہ مختلف ہوا کرتے ہیں، اس وجہ سے ان چیزوں کا اثر لوگوں کی سوچ اور طبیعت پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے بغداد میں بعض فقہی آراء ایسے تھے جنہیں مصر میں مقیم ہونے کے بعد آپ نے ترک کر دیا، ان فقہی آراء کا مجموعہ فقہ قدیم کے نام سے مشہور ہے۔ علماء امام شافعی کے افکار میں اس تبدیلی کو مصری ماحول کے اثرات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ عراق کے ماحول سے

متاثر ہو کر اپنے فقہ میں قیاس پر زیادہ اعتماد کیا اور امام مالک رحمہ اللہ مدینہ کے ماحول سے متاثر ہو کر تعاملِ اہلِ مدینہ کو خبر واحد پر ترجیح دی اور اسے تواتر عملی کا درجہ دیا۔[۶]

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف جگہوں کی طبعی عوامل کا بھی اس علاقے کے لوگوں کے مزاج پر گہرا اثر ہوتا ہے، چنانچہ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی فکرِ اجتماعی سے نکلنے والا پہلا نظریاتی فرقہ خوارج کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خوارج کے مزاج میں شروع سے ہی سخت گیری اور شدت پسندی کا عنصر نمایان تھا، چنانچہ پہلی صدی کے خوارج نے حضرت علی و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سمیت بنی امیہ کے دوسرے خلفاء سے براءت کا اعلان کیا اور اپنے اس موقف میں وہ اس قدر سخت گیر ہوگئے کہ جو لوگ ان حضرات سے بیزاری کا اظہار کرتے تو انہیں اپنی صف میں جگہ دیتے اور دوسرے عقائد کے حوالے سے ان سے کوئی تعرض نہ کرتے تاہم جو لوگ ان سے بیزاری کا اظہار نہ کرتے تو باوجود ان کے مسلمان ہونے کے ان پر براہِ راست کفر کا فتوی لگاتے۔

خوارج کے مزاج میں سخت گیری اور شدت پسندی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات مکہ ومدینہ سے دور دیہات اور صحراؤں میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، ان کی زندگی نہ صرف غربت وافلاس سے عبارت تھی، بلکہ وہ تہذیب وتمدن سے بھی ناآشنا لوگ تھے، جہالت اور دیہاتی ماحول نے ان کی سوچ کا دائرہ بہت ہی تنگ کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی مرکزیت اور انتظام سیاست سے ناآشنا تھے اور ہر ایک اپنی انفرادی زندگی میں بڑی حد تک اجتماعی ومعاشرتی اور سماجی پابندیوں سے آزاد تھا۔ کسی امام یا حاکم کی اطاعت کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا جیسا کہ محمد عبدہ (م۱۹۰۵ء)[۷] کہتے ہیں:

> "وكانوا من أهل البادية في فقر مُدقع، وشدة وبلاء قبل الإسلام وبعده؛ لبعدهم عن القرى والحضر، فلم تتحسن أوضاعهم كثيرًا، وأصاب الإسلام شَغاف قلوبهم، مع سذاجة في التفكير، وضيق في التصور، وبُعد عن العلوم".[۸]
>
> (ترجمہ): خوارج دیہاتی قسم کے لوگ تھے جو اسلام سے پہلے اور بعد میں شہروں اور متمدن آبادیوں سے دور انتہائی غربت اور تنگی وسختی کی زندگی گزارتے تھے، چنانچہ ان کی حالت نہ سدھر سکی، اس سادہ لوحی، تنگ نظری اور جہالت کی حالت میں اسلام نے ان کے دلوں پر دستک دی۔

متمدن علاقوں سے دوری کی بناء پر خوارج میں سختی اور تنگ نظری کی طرف ہمیں قرآن مجید میں بھی اشارہ ملتا ہے، جیسا ارشادِ باری ہے:

الأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا".[۹] (ترجمہ): دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

علامہ مودودی اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ان کی اسی حالت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ دیہاتی وصحرائی لوگ زیادہ منافقانہ رویہ رکھتے تھے اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی تھی۔ پھر اس کی وجہ بھی بتادی گئی ہے کہ شہری لوگ تو اہل علم اور اہل حق کی صحبت سے مستفید ہو کر کچھ دین کو اور اس کی حدود کو جان بھی لیتے ہیں مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے پھیر ہی میں پڑے رہتے ہیں اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لیے دین اور اس کے حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔"[۱۰]

اس تناظر میں ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

" هم أجفى الناس طباعا وأخلاقا. وهذا هو المعهود المعروف أن أهل المدن أرقّ طباعا، وألطف من أهل سوادهم، وأهل الريف والسواد أقرب حالا من الذين يسكنون في البوادي؛ ولهذا قال تعالى: الأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا".[۱۱]

(ترجمہ): اعراب طبیعت اور اخلاق کے اعتبار سے سب سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں اور یہ بات مشہور ہے کہ شہر والے زیادہ نرم مزاج ہوتے ہیں اور گاؤں والوں سے زیادہ نرم خو ہوتے ہیں، دیہات اور مضافاتی علاقوں کے لوگ مزاج کے اعتبار سے گاؤں والوں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس وجہ سے ارشادِ باری ہوا کہ دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

چونکہ خوارج کی طبیعت میں سادگی اور سوچ میں تنگی تھی، اس وجہ سے اس قسم کی نفسیات کا اثر ان کے نظریات میں بھی نمایاں طور پر سامنے آگیا۔ خوارج کے مزاج میں زہد اور دنیا سے کنارہ کشی کا عنصر بھی دراصل فقر کے سبب سے تھا، معاش کی تنگی نے انہیں صبر و جفاکشی کا عادی بنادیا تھا۔

خوارج کے علاوہ اگر مرجئہ [۱۲] کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے زاویہ فکر میں بھی ماحول اور گرد و پیش کا اثر نمایاں نظر آتا ہے، کیونکہ عراق کے شہری علاقوں میں ہونے کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی خوشگوار تھی اور اس کے علاوہ مختلف تہذیبوں اور نظریات کے حامل لوگوں سے براہِ راست ان کا واسطہ پڑتا تھا، لہٰذا اس ماحول کا اثر مرجئہ کے مزاج میں نرمی اور امن پسندی کے طور پر ظاہر ہوا اور پھر اسی نرم دلی کا اثر ان کی نظریات میں بھی نظر آنے لگا، چنانچہ وہ کافر کو بھی کافر خیال نہیں کرتے تھے اور قرآنی نصوص میں آیات ترغیب اور آیات رحمت کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے اور آیات وعید اور عذاب کو مستبعد خیال کرتے ، چونکہ ان کے نظریات کی عمارت رجا یعنی اللہ تبارک و تعالی سے ہر حال میں اچھائی کی امید پر قائم تھی اس وجہ سے انہیں مرجئہ کہا جانے لگا چنانچہ ابنِ تیمیہ لکھتے ہیں:

والمرجئة تجدهم يتهافتون على نصوص الرحمة، ويملؤون الحديث بالرجاء، ويتناسون الوعيد۔ [۱۳]

(ترجمہ): مرجئہ کو آپ اس حال میں دیکھوگے کہ وہ رحمت والی آیتوں پر گر رہے ہوں (مطلب آیاتِ ترغیب پر ہی توجہ دیتے ہیں) اور رجا (امید) کی بات ہی کرتے ہیں اور وعید (سزا) کو بھلا دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر ہم دوسرے فرقوں پر غور کریں تو ان کے عقائد میں ماحول اور مخصوص ثقافتوں کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، چنانچہ اہلِ تشیع کے مذہبی عقائد کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کے اکثر مذہبی افکار پر اہلِ فارس کے عقائد کا رنگ نظر آتا ہے۔ جیسا کہ امام معصوم کا عقیدہ جسے شیعوں کے ہاں ایک خاص مقام حاصل ہے، یہ بھی دراصل ایک قدیم پارسی تصور ہے، جس میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو ایک خاص تقدس حاصل ہوتا تھا، چنانچہ یہی عقیدہ انہوں نے خاندانِ نبوت کے حوالے سے بھی اپنایا۔ اسی طرح بصرہ کو اسلامی تصوف کی جائے پیدائش قرار دیا جاتا ہے، چنانچہ اسلامی تصوف کا آغاز بصرہ سے اس وجہ سے ہوا کیونکہ بصرہ عیسائی راہبوں کی آمجگاہ رہا تھا، اس وجہ سے اس علاقہ میں راہبوں کے اثرات مسلمانوں کے دینی نفسیات پر اثر انداز ہوئے ۔ دوسری طرف اگر علمِ کلام کے حوالے سے دیکھا جائے تو علمِ کلام کے نامور علماء عرب سے نہیں تھے بلکہ یہ بھی عراق کے عجمی لوگ تھے، چونکہ عراق کی سرزمین مختلف قسم کی تہذیبوں اور ثقافتوں کی آماجگاہ رہ چکی تھی، اس وجہ سے اہلِ عراق علمِ کلام سے بہت جلد متاثر ہوئے :

وطينة العراق بها تداخُل حضارات وامتزاج معتقدات، فناسب الكلام جذورهم الوراثية، وبيئتهم الاجتماعية، وقابليتهم النفسية، وأساليبهم الفكرية[۱۴]."

(ترجمہ): عراق کی مٹی میں مختلف تہذیبوں اور عقائد کا آپس میں ملاپ ہوا ہے، چنانچہ علم کلام ان کے موروثی جڑوں، اجتماعی ماحول، نفسیاتی قابلیت اور سوچ کے انداز کے موافق نکلا۔

اہلِ فارس[۱۵] اور اہلِ عرب کے متنوع زاویہ فکر کا جائزہ:

دنیا کے مختلف اقوام کے درمیان عقلی اور نفسیاتی مفارقات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ بات علمی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مختلف امور کے حوالوں سے ہر قوم کی اپنی الگ ایک سوچ اور زاویۂ نگاہ ہوا کرتی ہے:

"تختلف الشعوب عقليا ونفسيا اختلافا كبيرا فعقلية الإنجليزي غير عقلية الفرنسي وهما غير عقلية المصري وهكذا. وهذه العقليات والنفسيات تختلف تبعا لاختلاف البيئة الطبيعية والاجتماعية التي تحيط بالأمة."[۱۶]

(ترجمہ): لوگ عقل اور نفسیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتے ہیں چنانچہ انگریز کی نفسیات فرانسیسی کے نفسیات سے مختلف ہیں اور اسی طرح ان کی نفسیات مصری شخص کی نفسیات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اور یہ نفسیات اور عقلی امور کسی قوم کے ارد گرد کے طبعی اور معاشرتی ماحول کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح عرب و عجم خصوصا اہلِ فارس کے متنوع زاویۂ فکر نے بھی مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو پروان چڑھانے میں اپنا اثر دکھایا۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ یہاں پر مختصر طور پر عرب و عجم کی نفسیات کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے:

عربوں کی نفسیات:

اہلِ عرب اسلام سے قبل تہذیب و تمدن سے ناآشنا لوگ تھے تاہم وحشیانہ قبائلی روایات کے ہوتے ہوئے ان میں اچھی عادتیں، جیسے عفو و کرم، مہمان نوازی، شجاعت اور دلیری کے اوصاف بھی پائے جاتے تھے۔ خاص طور سے وہ اپنے وفائے عہد و پیمان کے بہت پابند تھے یہاں تک کہ اپنے عہد و پیمان کی خاطر جان کی بازی لگادیتے تھے۔ اپنے گھر اور نجی زندگی میں بہت بڑے مہمان نواز، مہربان اور سخی تھے۔[۱۷]

عربوں کے درمیان اگرچہ پانی کے ذخیروں اور چراگاہوں کے حوالے سے رقابت اکثر کشمکش کا باعث بنتی تھی لیکن دوسری طرف ان کے اندر کمزوری اور عاجزی کے احساس نے ان کے مزاج کی سختی اور

لجاجت کے مقابلہ میں بعض نرم اور مثبت تبدیلیاں پیدا کی تھی، مثال کے طور پر خانہ بدوش معاشرہ میں اس وقت مہمان خانوں اور دارِ ضیافت کی اہم ضرورت تھی، اس وجہ سے سبھی نے رسمِ ضیافت اور مہمان نوازی کو ایک معاشرتی قدر کے طور پر اپنالیا۔[۱۸]

سیاسی حالت:

عہد جاہلیت میں سیاسی اعتبار سے عرب[۱۹] کسی مرکزی حکومت کے باجگزار نہ تھے۔ وہ صرف اپنے ہی قبیلے کی طاقت کے بارے میں سوچتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ ان کا سلوک تشدد آمیز اور سخت ہوا کرتا تھا۔[۲۰]

قبیلوں کی تشکیل:

عرب انفرادی اور طبعی طور پر خود غرض قسم کے لوگ تھے تاہم انہوں نے بیابانوں میں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کیا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ تنہا رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ جن افراد کے ساتھ ان کا خونی رشتہ ہے یا حسب و نسب میں ان کے شریک ہیں ان سے اپنے گروہ کی تشکیل کریں، جن کا نام انہوں نے "قبیلہ" رکھا۔ قبیلہ ایسا مستقل و متحد دستہ تھا جس کے ذریعے عہد جاہلیت میں عرب قومیت کی اساس و بنیاد شکل پذیر ہوتی تھی۔ چنانچہ ہر اعتبار سے وہ خود کفیل تھے اور کسی بھی مرکزی حکومت کے زیرِ اثر نہیں تھے۔[۲۱]

دورِ جاہلیت میں عربوں کے اقتدار کا معیار قبائلی اقدار پر منحصر تھا۔ ہر فرد کی قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا تھا کہ قبیلے میں اس کی کیا حیثیت ہے اور اہل قبیلہ میں اس کا کس حد تک اثر و رسوخ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قدر و منزلت کے اعتبار سے قبائل کو بلند مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ دوسری طرف کنیزوں اور غلاموں کو قبائل کے ادنیٰ ترین اور انتہائی پست ترین افراد میں شمار کیا جاتا تھا۔[۲۲]

اہلِ فارس کی صفات و نفسیات:

دوسری طرف عربوں کے برعکس اہلِ فارس تہذیب و تمدن اور سیاست سے آشنا تھے اور عربوں کی بہ نسبت زیادہ شاطر تھے، دوسری طرف عربوں نے چونکہ آزاد قبائلی زندگی گزاری تھی تو ان کے دلوں میں حاکم کے لیے کوئی خاص منزلت نہیں تھی اور جہاں تک اہلِ فارس کا تعلق ہے تو وہ بادشاہ اور اس سے متعلق ہر چیز کو بہت ہی تقدس کی نظر سے دیکھتے تھے۔

دراصل فارسی حکمرانوں نے رعایا کو مطیع بنانے کے لیے کافی جد وجہد کی تھی اور مختلف طریقوں سے عوام کے دلوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کی ہیبت بٹھانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ جیسا کہ اردشیر[۲۳] اپنے بھانجوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"واعلموا أنه لا سبيل إلى أن يعظم الوالي إلا بإصابة السياسة ورأس إصابة السياسة أن يفتح الوالي من قبله للرعية بابين: أحدهما باب رقة ورحمة ورأفة وبذل وتحنن وإلطاف ومواساة ومؤانسة وعفو وانبساط، والآخر باب غلظة وخشنة وتعصب وجفاء ومباعدة وإقصاء وعبوس وعقوبة ومحقرة إلى أي يبلغ القتل."[۲۴]

(ترجمہ): جان لو کہ درست سیاست کے علاوہ حاکم کی تعظیم کا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور درست سیاست کی راز اس میں ہے کہ حاکم اپنی طرف سے عوام کے لیے دو دروازے کھلے رکھے، ایک دروازہ نرم خوئی، شفقت و محبت، سخاوت، رحم دلی، توجہ، غم خواری، محبت، عفو اور خوشدلی کا ہے اور دوسرا شدت، سختی، تعصب، ظلم وجور، دوری، کنارہ کشی، ترش روئی، سزا اور حقارت سے لے کر قتل تک کا دروازہ ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اپنے ولی عہد کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"أن لا يبخل، أن لا يكذب، أن لا يغضب، أن لا يلعب ويعبث, أن لا يفرغ، أن لا يحسد ، أن لا يخاف، أن لا يفشي أسراره للصغار من الأهل والخدم وأن يقاوم الهوى ويعتمد الرأي. "[۲۵]

(ترجمہ): وہ بخل نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، غصہ نہ کرے، کھیل کود نہ کرے، فارغ نہ رہے، حسد نہ کرے، خوف نہ کرے، اپنے راز چھوٹے خدمت گاروں کے سامنے فاش نہ کرے، نفس کی مخالفت کرے اور اپنی رائے پر اعتماد کرے۔

اسی طرح اردشیر اپنے ولی عہد کو حکومت کے طمع کاروں سے ہوشیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"واعلموا أن ابن الملك وأخا الملك وابن أخ الملك وابن عم الملك كلهم يقول: كدت أن أكون ملكا وبالحري أن لا أموت حتى أكون ملكا ولذلك يجب تضييق دائرة وراثة العرش حتى يقل طلاب الملك."[۲۶]

(ترجمہ): جان لو کہ بادشاہ کا بیٹا، ان کا بھائی، چچازاد اور ماموں زاد سب یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ عنقریب میں بادشاہ بنوں گا اور مناسب یہی ہے کہ میں بادشاہ بننے سے

پہلے نہ مر جاؤں، اسی وجہ سے ضروری ہے کہ عرش کے ورثاء کو محدود کیا جائے تاکہ تختِ شاہی کے طلبگاروں کی تعداد کم ہو جائے۔

درج بالا اقتباسات سے اس امر کا اندازہ ہوا کہ اہلِ فارس عربوں کی بہ نسبت امورِ حکمرانی میں زیادہ ماہر اور تجربہ کار تھے اور ان کے ہاں مرکزی سلطنت کا نظام قائم تھا اور شاہی خاندان کو عوام کے معاملات میں بے حد اثر ورسوخ حاصل تھا۔

فارسی ریاست کا روحانی پہلو:

دوسری طرف فارسی ریاستوں میں دینی اور روحانی شخصیات کو بھی کافی معاشرتی اور سیاسی اثر ورسوخ حاصل تھا، گویا کہ وہ ریاست کے اندر ایک متوازی ریاست کے مرتبے پر تھے، چنانچہ ایک یورپی مصنف کریسٹنسن ارتھر ساسانی ریاست کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"لقد سار رجال الدين في الدولة الساسانية مع نبلاء الإقطاع جنبا إلى جنب وفي أثناء عهود الانحلال كان رجال هاتين الطبقتين، رجال الدين والنبلاء يتحدون ضد الملك، ومن جهة أخرى كان حضور سلطتهم الروحية مباشرا في جسم المجتمع فأسبغت على مختلف مظاهر الحياة اليومية، كانت سلطة رجال الدين تتدخل في حياة كل فرد منهم فهي بهذا المعنى كانت تلازم الرجل من المهد إلى اللحد، كان الجميع يجلون رجال الدين وينظرون إليهم بكثير من التعظيم. "[۲۷]

(ترجمہ): ساسانی سلطنت کے اندر دینی رموز جاگیردار اشرافیہ طبقے کے شانہ بشانہ ہوا کرتے تھے چنانچہ عدمِ استحکام کے زمانے میں یہ دونوں طبقے یعنی دینی رموز اور اشرافیہ طبقہ بادشاہ کے خلاف متحد ہوگئے، دوسری طرف دینی رموز کی روحانی سطوت براہ راست معاشرہ کے جسم میں پیوست ہو چکی تھی اور روزمرہ زندگی کے مختلف امور میں اس کا رنگ چڑھ گیا تھا، دینی رموز کی تاثیر معاشرہ کے ہر فرد کی زندگی میں اپنا اثر پذیری دکھارہی تھی اور یہ تاثر مہد سے لحد تک قائم رہتا، چنانچہ تمام لوگ دینی رموز کا احترام کرتے اور بہت ہی تعظیم کی نظر سے انہیں دیکھتے تھے۔

اہلِ فارس کے ہاں رموزِ دین کی اس غیر معمولی اثر ورسوخ کی وجہ سے شاہی خاندان کے ساتھ عموماً کشیدہ حالات رہتے چنانچہ شاہوں نے لوگوں کے دلوں پر اپنا رعب ودبدبہ بٹھانے کی غرض سے اپنے

حوالے سے من گھڑت قسم کے افسانے مشہور کئے، جن میں بادشاہوں کی غیر معمولی خصوصیات ذکر کئے جانے لگے، جیسا کہ مسعودی (م ۳۴۶ھ) اردشیر کے زمانے میں اس قسم کے ایک افسانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اليوراسب ملك ألف سنة، والفرس تغلو فيه وتذكر من أخباره أن حيتين كانتا على كتفيه لا تهدآن إلا بأدمغة الناس وأنه كان ساحرا يطيعه الجن والإنس وملك الأقاليم السبعة ...."[۲۸]

(ترجمہ): ہزار سالوں کا بادشاہ یوراسب جس کے بارے میں اہلِ فارس مبالغہ سے کام لیتے تھے اور ان کے افسانوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہر وقت اس کے کندھے پہ دو سانپ بیٹھے رہتے تھے اور لوگوں کے مغز کھانے سے ہی انہیں سکون ملتا تھا اور یہ کہ وہ ایسے جادو گر تھے کہ جن وانس اور ساتوں اقالیم کے بادشاہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔

اس قسم کے افسانوں کی وجہ سے لوگ بادشاہوں کو خداؤں کا درجہ دینے لگے چنانچہ اگر وہ لوگوں کو عبادت کے لئے اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیتے تو وہ ان کا حکم بجالاتے یہاں تک کہ مختلف شہروں میں بادشاہوں کے بڑے بڑے مجسمے رکھ کر ان کی پرستش کی جانے لگی۔[۲۹]

شاہانِ کسریٰ کے بارے میں عوام کے اس قسم کے اعتقادات کی وجہ سے شاہی خاندان کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گیا تھا اور ان کا یہ ذہن بن گیا تھا کہ بادشاہت دراصل شاہی خاندان ہی کا حق ہے اور اس کے علاوہ کسی کو امیر یا حاکم بننے کا کوئی حق نہیں۔

اسی قسم کے نفسیاتی اور طبعی مفارقات کے ہوتے ہوئے عرب اور عجم کے درمیان کشمکش روزِ اول سے چلی آرہی تھی اور بسا اوقات معاملہ جنگ وجدال تک پہنچ جاتا تھا:

"والمنافسة بين العرب والعجم قديمة، فإن الفرس في أيام دولتهم كثيرا ما كانوا يخرجون العرب من بلادهم بالسيف والعرب كانوا يسطون على مدن الفرس."[۳۰]

(ترجمہ): عرب اور عجم کے درمیان کشمکش پرانی ہے، پس اہلِ فارس اپنے حکمرانی کے دور میں عربوں کو بزورِ تلوار اپنے علاقوں سے نکال دیتے تھے اور اہلِ عرب فارسی شہروں پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔

بیعتِ اسلامی اور بیعتِ کسروی:

صدرِ اول میں خلیفہ کی بیعت کا مطلب یہ تھا کہ اختیاری طور پر آزادانہ طریقہ سے حاکم کے ہاتھ پر بیعت کی جائے، یعنی حاکم کے انتخاب میں فرد کی شخصی خواہش کو ایک احترام حاصل تھا، اس لیے انتخابات کی بجائے شورائی نظام کو اختیار کیا گیا، جس میں کسی فرد کی نامزدگی کے بعد عوام سے اس کی بیعت کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں اس طریقہ کار پر سیاسی حالات کی وجہ سے عمل نہیں ہو سکا تاہم خلفائے راشدین کے زمانے میں بیعت کا یہی طریقہ کار رائج رہا۔ اسی طرح بیعت کا عمل بیعت کرنے والے اور خلیفہ کے درمیان مصافحہ کرنے سے مکمل ہوتا، جس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذاتی انا و تقدس کا خیال رکھا جاتا۔

دوسری طرف شاہانِ کسریٰ کے ہاں بیعت شکل اور مضمون دونوں حوالوں سے اسلامی بیعت کے طریقہ کار سے مختلف تھا چنانچہ شاہی خاندان کا کوئی فرد بزورِ قوت رعایا سے بیعت لیتا اور بیعت کا طریقہ محض مصافحہ سے طے نہیں ہوتا تھا بلکہ لوگ بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے اور طرح طرح کی ذلت آمیز حرکات بجالاتے۔ جیسا کہ ابن خلدون (م۸۰۸ھ) اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"وأما البيعة المشهورة لهذا العهد فهي تحية الملوك الكسروية من تقبيل الأرض أو اليد أو الرجل، واستغنى بها عن مصافحة أيدي الناس التي هي الحقيقة في الأصل لما في المصافحة لكل أحد من التنزل والابتذال المنافيين للرئاسة وصون المنصب الملوكي".[۳۱]

(ترجمہ): اس زمانے کی مشہور بیعت زمین بوسی، ہاتھ بوسی، پاؤں بوسی کی صورت میں شاہانِ کسریٰ کی سلامی تھی اور بیعت کی یہ شکلیں مصافحہ کی جگہ متعارف کرائی گئیں جو کہ درحقیقت بیعت کا اصل طریقہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی، مصافحہ میں بادشاہی منصب کی ایک قدر حقارت تھی۔

یوں شرعی بیعت کی صورت میں باوقار افراد پر مشتمل ایک شفاف معاشرہ وجود میں آتا ہے اور کسروی بیعت کی صورت میں حقیر افراد پر مشتمل استحصالی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

مسئلہ خلافت اور عرب وعجم زاویہ فکر کا تنوع:

چونکہ قیصر وکسریٰ کے سلطنتوں کے سرنگوں ہونے کے بعد مسلمانوں کے ہاں خلافت وحکومت کے حوالے سے اہلِ فارس واہلِ روم کے درج بالا سیاسی مزاج کا بھی دخل رہا، اس وجہ سے ان حضرات نے اپنی

پرانی روایت کو سامنے رکھ کر اہلِ بیت کو خلافت کا حق دار ٹھرایا اور یہ نظریہ اپنایا کہ خلافت دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا لیکن ان سے یہ حق غصب کر لیا گیا ہے، چنانچہ زاویۂ فکر کے اس تنوع نے مسلمانوں کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر اختلافات کو مزید فروغ دیا۔

درحقیقت اہلِ فارس کے ہاں اسلام سے پہلے دینی قیادت وسیادت کسی خاص قبیلہ میں مرکوز ہوتی تھی، چنانچہ قدیم زمانے میں فارس کے اندر دینی پیشوائی اور حکمرانی قبیلۂ میدیا میں مرکوز تھی، زرتشتی مذہب کے غلبہ کے بعد یہ پیشوائی قبیلۂ المغان کی طرف منتقل ہو گئی، پروہتوں کے طبقہ (Priest Class) کے بارے میں اہلِ ایران کا عقیدہ تھا کہ وہ زمین اور اہلِ زمین پر سایۂ خداوندی (ظل اللہ) ہیں اور وہ معبودوں کی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، لہٰذا حکمران کا اسی قبیلہ سے ہونا وہ ضروری خیال کرتے تھے، چنانچہ وہ آتش کدہ کے انتظام کا منصب تنہا اسی قبیلہ کا حق تصور کرتے تھے[۳۲]، جیسا کہ عصرِ حاضر کے محقق ڈاکٹر احمد امین[۳۳] (م ۱۹۵۴ء) لکھتے ہیں:

> "ایرانیوں میں سے ایک بڑی تعداد نے تشیع اس لیے قبول کیا کہ ایرانی شہنشاہی کے زمانے میں حکمران خاندان کی غیر معمولی تعظیم وتقدیس ان کے ہاں لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ حکمرانوں کی رگوں میں جو خون دوڑتا ہے وہ رعایا کے خون کے جنس سے نہیں ہے، جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی نظر سے دیکھا جیسے وہ اپنے ہاں شاہانِ کسری کو دیکھتے تھے اور آپ کے خاندان کے لوگوں کو اس نظر سے دیکھنے لگے جیسا کہ وہ حکمران خاندان کو دیکھنے کے عادی تھے۔"[۳۴]

چنانچہ اہل فارس جو اسلام میں داخل ہوئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد امامت کے مسئلہ کو بھی اپنے اس مخصوص زاویۂ فکر سے دیکھا اور اہلِ بیت کو امامت کا حق دار سمجھا، ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر اسلامی اور عرب زاویۂ فکر سے متصادم تھا، اس وجہ سے امامت کے مسئلہ پر مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

خلاصہ بحث:

۱. امتِ مسلمہ کی تقسیم کی ابتداء خلافت کے مسئلہ پر صدرِ اول میں پیدا ہونے والے سیاسی اختلافات سے ہوا۔

۲. خلافت، امامت یا امارت کی اصطلاحیں اسلامی ادب میں عموماً مترادف معنوں میں استعمال ہوئی ہیں تاہم اگر غور کیا جائے تو خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو فرق stateاور governmentکے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔

۳. خلافت کے حوالے سے عرب و عجم زاویہ فکر کے تنوع نے مسلمانوں کے درمیان اختلافات کے فروغ میں ہر دور میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

۴. اسلام فرقوں کے عقائد میں ماحول اور مخصوص ثقافتوں کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، چنانچہ اہلِ تشیع کے مذہبی عقائد کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کے اکثر مذہبی افکار پر اہلِ فارس کے عقائد کا رنگ نظر آتا ہے۔

۵. امام معصوم کا عقیدہ جسے شیعوں کے ہاں ایک خاص مقام حاصل ہے، یہ بھی دراصل ایک قدیم پارسی تصور ہے، جس میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو ایک خاص تقدس حاصل ہوتا تھا، چنانچہ یہی عقیدہ انہوں نے خاندانِ نبوت کے حوالے سے بھی اپنایا۔

۶. اہلِ فارس تہذیب وتمدن اور سیاست میں عربوں سے زیادہ آشنا تھے، عربوں نے چونکہ آزاد قبائلی زندگی گزاری تھی تو ان کے دلوں میں حاکم کے لیے کوئی خاص منزلت نہیں تھی اور جہاں تک اہلِ فارس کا تعلق ہے تو وہ بادشاہ اور اس سے متعلق ہر چیز کو بہت ہی تقدس کی نظر سے دیکھتے تھے۔

۷. اسلامی تاریخ میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے سرنگوں ہونے کے بعد مسلمانوں کے ہاں خلافت وحکومت کے حوالے سے اہلِ فارس و اہلِ روم کے ہاں موجود سیاسی مزاج کا بھی دخل رہا، اس وجہ سے ان حضرات نے اپنی پرانی روایت کو سامنے رکھ کر اہلِ بیت کو خلافت کا حق دار ٹھہرایا اور یہ نظریہ اپنایا کہ خلافت دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا لیکن ان سے یہ حق غصب کر لیا گیا ہے، چنانچہ زاویۂ فکر کے اس تنوع نے مسلمانوں کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر اختلافات کو کشیدہ بنا دیا۔

حواشی وحوالہ جات:

۱. آل عمران: ۱۹۰

۲. الأنعام: ۱۰۴

[3]. اصلاحی، امین احسن، جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل، ص: ۱۶۵، دار التذکیر، لاہور، ۲۰۰۵

[4]. الشهرستاني ، محمد بن عبدالكريم ، تحقيق: محمد سيد كيلاني، الملل والنحل ، ج١، ص: 20، دار المعرفة، بيروت، لبنان، ١٤٠٤ هـ

[5]. بليل، عبد الكريم، أسباب الاختلاف بين المسلمين، ص: ١، شبكة الألوكة، http://www.alukah.net/culture/0/45906

[6]. القطان، مناع بن خليل، تاريخ التشريع الإسلامي، ج١، ص: ٣٥٣، مكتبة وهبة، الجدة، السعودية، ٢٠٠١

[7]. محمد عبدہ دورِ حاضر میں مصر کے معروف دانشور اور مجدد گزرے ہیں، آپ ۱۸۴۹ء میں مصر کے بحیرہ صوبے میں پیدا ہوئے، علامہ جلال الدین افغانی کے ساتھ مل کر اسلام کی تجدید واحیاء کے لیے جد وجہد کی اور کئی تجدیدی کام سرانجام دیئے، آپ کی اہم تصنیفات میں رسالة التوحيد، تقرير إصلاح المحاكم الشرعية، العروة الوثقى اور مقدمة فى أسباب اختلاف المسلمين قابلِ ذکر ہیں۔

[8]. العبده، محمد، مقدمة في أسباب اختلاف المسلمين وتفرقهم، ص، ٣٩، دار الأرقم، كويت، ١٩٨٦

[9]. التوبة: ٩٧

[10]۔ مودودی، ابوالاعلی، تفہیم القرآن، ج ۲، ص: ۱۷۹، ترجمان القرآن اکیڈمی، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۱ء

[11]. ابن كثير، اسماعيل بن عمر، تحقيق: سامي بن محمد سلامة، ج٤، ص: ٤٢٣، دار طيبه للنشر والتوزيع، المدينة المنورة،١٩٩٩

[12]. مرجئہ ایک گمراہ فرقہ ہے جس کے بنیادی عقائد کے اعتبار سے ایمان کے ساتھ کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح کفر کے ساتھ کسی نیکی کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، مرجئہ کا لفظ اِرجاء سے نکلا ہے جس کا مطلب تاخیر کے ہیں، چونکہ یہ لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب کے انجام کو یوم آخرت تک مؤخر رکھتے تھے، اس وجہ سے انہیں مرجئہ یعنی مؤخر کرنے والا فرقہ کہا گیا، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔۔۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الفرق بين الفرق: ص: ١٧٨ ؛ الملل والنحل، ج1 ص: ١٣٨

[13]. منهاج السنة، ج٥، ص: ١٣٣

[14]. أسباب الاختلاف بين المسلمين، ص: ١

[15]. زمانہ قدیم اور قرون وسطی سرزمین ایران پر قائم ہونے والی سلطنتوں کو مجموعی طور پر فارسی سلطنتیں یا سلطنتِ کسرویہ کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی سلطنت ہخانیشی سلطنت تھی۔ ۱۹۳۵ء تک فارس ایران کا سرکاری نام تھا (اسے پارس بھی کہا جاتا ہے) ملاحظہ ہو: گوستاولوبون، تمدن اسلام و عرب، ترجمہ: سید ہاشم حسینی، ص: ۳۱ کتاب فروشی اسلامیہ تہران ۱۹۷۷ء

[16]. أحمد أمين، فجر الإسلام، ص: ۳۰، مكتبة النهضة المصرية ، قاهره ۱۹۶۴

[17]۔ أيضا، ص: ۳۲

[18]. أيضا، ص: ۷۶

[19]. عرب جس کو ''جزیرۃ العرب'' بھی کہتے ہیں، دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے جو مغربی ایشیا کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ جزیرہ شمال مشرق سے جنوبِ مشرق تک ''غیر متوازی چوکور'' شکل میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی مساحت تقریباً بتیس (۳۲) لاکھ مربع کلو میٹر ہے. اس جزیرہ نما کے تقریباً ۴۵ حصے میں اس وقت سعودی عرب واقع ہے. اور اس کا بقیہ حصہ دنیا کی موجودہ سیاسی تقسیم بندی کے اعتبار سے چھ ملکوں یعنی یمن، عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور کویت میں بٹا ہوا ہے۔ اس جزیرہ نما کی سرحد، جنوب کی سمت سے خلیج عدن، باب المندب، بحر ہند اور بحر عمان میں محدود ہے اور مغرب کی سمت میں یہ بحر احمر اور مشرق کی طرف خلیج عمان، خلیج فارس اور عراق تک پھیلا ہوا ہے۔ چوتھی صدی کا مسلمان دانشور مقدسی (م ۳۸۸ھ) کہتا ہے کہ ملک عرب چار بڑے علاقوں، حجاز، یمن، عمان اور ہجر پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو: مقدسی ، أحسن التقاسيم فی معرفة الأقاليم، ص: ۱۰۲ دار صادر بيروت، لبنان، لیکن حموی کے نزدیک وہ پانچ حصے یعنی تہامہ، حجاز، نجد، یمن اور عروض پر مشتمل ہے. مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، معجم البلدان، ج۳، ص: ۴۰۱

[20]. آلوسي، محمود شكري، بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب، ج۲، ص: ۳۰۳، دار الكتب الحديثة، قاهره، ۱۹۹۲

[21]. أيضا، ص: ۳۲۱

[22]. نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، تاریخ اسلام، ج۲، ص: ۸۷، دار اشاعت کراچی، پاکستان، ۱۹۹۱ء

[23]. اردشیر بن شیرویہ جسے اردشیر سوم بھی کہا جاتا ہے، معروف ساسانی بادشاہ گزرا ہے، جس نے ۶۲۸ء سے لے کر ۶۳۰ء تک تقریبا ڈیڑھ سال حکومت کی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تمدن اسلام و عرب، ص: ۱۳۳

[24]. ابن مقفع، عبد الله، أيين نامة ـ في عادات الفرس.، ص: ۳۲، دار صادر بيروت، لبنان، ۱۹۸۲

[25]. أيضا، ۷۶ ـ ۷۷

[26]. أيضا ، ص: ٨٠

[27]. كريستنسن، أرثر، ايران فى عهد الساسانيين، ص: ١٠٣ ـ ١٠٤، وزارة التربية والتعليم، القاهرة ـ ١٩٨٥ء

[28]. التنبيه والإشراف، ج١، ص:٧٥

[29]. أيضا

[30]. جرجي زيدان، تاريخ التمدن الإسلامي، ص: ٢٩٤، منشورات مكتبة الحياة، بيروت، لبنان، ١٩٩٥

[31]. المقدمة ج١، ص: ٢١١

[32]. ندوی، سید ابوالحسن علی، دو متضاد تصویریں: عقائدِ اہلِ سنت اور عقائدِ فرقۂ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ، ص: ۷۷، حاجی عارفین اکیڈمی، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۱ء

[33]. مصر کے معروف اسلامی مفکر اور مؤرخ گزرے ہیں، آپ ۱۹۵۴ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے، تالیف و تحقیق کے ساتھ ساتھ آپ کئی ایک سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے، آپ کی تصانیف میں یوم الإسلام، فيض الخاطر، النقد الأدبي اور ضحى الإسلام قابلِ ذکر ہیں۔

۳۴. أحمد أمين، ضحى الاسلام، ج٣، ص: ٢٠٩، دار صادر بيروت، لبنان، ١٩٩٠